اردو (لازمی)	انٹر (پارٹ-I)	پرچہ I: (انشائیہ طرز)
وقت: 2.40 گھنٹے	2016ء (پہلا گروپ)	کل نمبر: 80

(حصہ اوّل)

سوال 2-(الف) درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔ نظم کا عنوان اور شاعر کا نام بھی تحریر کیجیے:

(8,1,1)

گر یار کی مرضی ہوئی، سر جوڑ کے بیٹھے   گھر بار چھڑایا تو وہیں چھوڑ کے بیٹھے

موڑا انھیں جیدھر، وہیں منہ موڑ کے بیٹھے   گدڑی جو سلائی تو وہی اوڑھ کے بیٹھے

اور شال اوڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں   پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

جواب: حوالۂ متن:

نظم کا عنوان: تسلیم و رضا   شاعر کا نام: نظیر اکبر آبادی

تشریح:

ان اشعار میں شاعر بیان کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مل بیٹھنا اور ہر کام باہمی مشاورت سے کرنا پسند کیا تو ہم آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور اگر اس نے گھر بار ترک کرنے کو کہا تو اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ گویا محبوب کی مرضی سے ذرا برابر انحراف نہ کیا۔ اس کی رضا کے سامنے اپنی مرضی قربان کر دی۔ انھیں جس طرف چلایا گیا اور جیسے چلایا گیا وہ چلتے رہے۔ اگر فقر اختیار کرنے والے لوگوں کو درویشوں جیسا لباس سلوا کر دیا گیا تو انھوں نے وہی خوش ہو کر زیب تن کر لیا۔ اور اگر گدڑی پہنائی گئی تو اسے بخوشی قبول کر لیا اور اطمینان کی نعمت سے فیض یاب رہے۔ اور اگر انھیں امیرانہ لباس دیا گیا تو اسے بھی بے چوں و چرا پہن لیا۔ گویا مرد کامل وہی ہیں جو ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ مرد کامل تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ کی رضا کیا ہے۔ وہ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں ڈبو دیتے ہیں اور ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

میں ہوں پتنگ کاغذی اور ڈور ہے اس کے ہاتھ میں
چاہا ادھر گھٹا لیا' چاہا اُدھر بڑھا لیا

شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندے درویش صفت ہوتے ہیں۔ شانِ امارت ہو یا گردشِ ایام کے تھپیڑے' ان کے دل ہر قسم کے غم سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ پریشانی میں اندر ہی اندر کڑھتے نہیں' بلکہ ہر کام کے بارے میں یہی سمجھتے ہیں کہ یہی اللہ کی رضا ہے۔ اس لیے وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

(ب) درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے اور شاعر کا نام بھی تحریر کیجیے: **(9,1)**

آتش و آب کا ممکن نہیں' یک جا ہونا — کچھ غلط بھی تو نہیں تھا' مرا تنہا ہونا
روح کا جاگنا اور آنکھ کا' بینا ہونا — ایک نعمت بھی یہی' ایک قیامت بھی یہی
دوستو! کتنا بُرا تھا مرا اچھا ہونا — جو بُرائی تھی مرے نام سے منسوب ہوئی

جواب: شاعر کا نام: احمد ندیم قاسمی

شعر نمبر-1
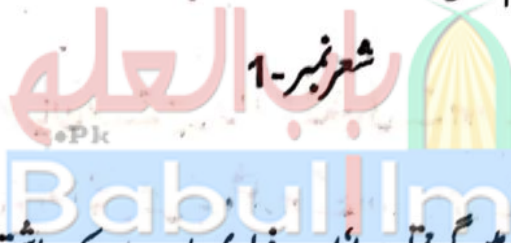
تشریح:

شاعر اپنے محبوب کی محبت میں گرفتار رہا' اور یہ فطری بات ہے کہ عاشق اپنے محبوب کی قربت چاہتا ہے' لیکن شاعر کی قسمت میں محبوب کا وصل نہ تھا۔ وہ یہی خواہش دل میں لیے تمام عمر تڑپتا رہا۔ شاعر جانِ بے قرار لیے مایوس اور ناامید رہا' لیکن شاعر کا حوصلہ دیکھیے کہ اس نے غمِ جدائی کا ذمہ دار نہ تو قسمت کو ٹھہرایا اور نہ ہی محبوب کو۔ اس نے اس کرب کو ایسے انداز میں بیان کیا کہ اس کا الزام اس کے محبوب پر نہیں آتا۔ شاعر کا کہنا ہے کہ:

ہوا جدا نہ کبھی غم تیری جدائی کا
رہا ہمیشہ میری جانِ بے قرار کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ میں جو تمام عمر دردِ فرقت میں تڑپتا رہا اور مجھے محبوب کی رفاقت نصیب نہیں

ہوئی، تو یہ کوئی غلط بات بھی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے جس طرح آگ اور پانی کبھی یکجا نہیں ہو سکتے، اسی طرح میرے محبوب سے میری فرقت بھی عین فطرت ہے۔ چونکہ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے اس کا الزام کسی پر بھی نہیں دھرا جا سکتا۔ شاعر اپنی جدائی کے سانحے کو ایک حقیقت قرار دیتا ہے اس لیے باوجود درد و الم کے مطمئن ہے اور کسی کا شاکی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو سوزِ عشق میں جلنے والی آگ اور محبوب کو تسکین بخش پانی سے تشبیہ دیتا ہے اور آگ پانی کا میل نہ ہونا فطری اصولوں کے عین مطابق قرار دیتا ہے۔

شعر نمبر-2

تشریح:

انسان اپنے حواس، آگہی، شعور اور جذبے کی ایک مکمل تصویر ہے؛ تاہم ان چیزوں کے موافق یا غیر موافق ہونے کا انحصار حالات اور اس معاشرے پر ہے، جس میں ایک حساس شاعر سانس لیتا ہے۔ اگر حالات سازگار ہوں تو یہی روح کی بیداری اور آنکھ کی بصارت ایک نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ روح اور بینائی انسان کو مسرت و شادمانی سے ہم کنار کرتے ہیں اور اس کے لیے لطف کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور اگر حالات اچھے نہ ہوں، معاشرے میں انتشار، افراتفری اور فتنہ فساد ہو تو انسان کا احساس و شعور، اس کی روح کی بیداری اور بصیرت و بینائی، بابصیرت انسان کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ وہ کڑھتا اور پریشان ہوتا ہے۔

شعر نمبر-3

تشریح:

بعض اوقات راہِ خیر پر چلنے والوں کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیکی کا پرچار کرنے کی روش مہنگی پڑتی ہے۔ معاشرے کو جنت بنانے کا خواب دیکھنے والوں کی زندگی اجیرن بنا دی جاتی ہے۔ خیر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کی تصویر کا المناک رخ ہے، جس نے ہماری سوچ کو صحیح سمت میں پروان نہیں چڑھنے دیا کہ ہم لوگ کسی کو اچھائی کا صلہ دینے

کی بجائے اس کی خامیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بدگمانی وعیب جوئی نے معاشرتی اقدار کو گہنا دیا ہے اور صورتِ حال شاعر کے اس شعر کی سی ہو چکی ہے:

احباب کو رہی میرے عیبوں کی جستجو
میں پُر خلوص ان کے ہنر تولتا رہا

شاعر نے ایسے معاشرے پر تنقید کی ہے جہاں کسی شخص کے لیے خیر کا راستہ اپنانا مشکل اور بدی کی راہ اختیار کرنا آسان ہوتا ہے۔

(حصہ دوم)

سوال :3- سیاق وسباق کے حوالے سے کسی ایک جزو کی تشریح کیجیے۔ مصنف کا نام اور سبق کا عنوان بھی تحریر کیجیے: **(10,3,1,1)**

(الف) "ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیز گاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اس شخص کا اس کے زمانہ میں اور آئندہ زمانے میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا، مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔"

جواب : حوالہ متن:

سبق کا عنوان: اپنی مدد آپ   مصنف کا نام: سر سید احمد خاں

سیاق وسباق:

یہ اقتباس سبق کے آخر سے لیا گیا ہے۔ مضمون نگار سر سید احمد خاں اپنی مدد آپ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی اور تہذیب کی منزل کو حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش، جذبہ اور شعور پیدا نہ ہو۔ قومی ترقی کے سلسلے میں ہمارا یہ خیال ہے کہ ہمیں حضرت خضرؑ جیسا کوئی سچا راہنما ملے۔ اس طرح کوئی راہنما ہمیں بھی ملے کہ ہماری قوم بھی ترقی کے منازل تک رسائی حاصل کر سکے۔

تشریح:

اس پیراگراف میں انسان کی عملی زندگی اور چال چلن کو آئندہ نسل کو سنوارنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں کہتے ہیں کہ انسان کو عاجز و مسکین ہونا چاہیے۔ اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیز گاری کی تعلیم دینی چاہیے اور خود بھی محنت، پرہیز گاری اور ایمانداری پر عمل کر کے اپنے ساتھیوں کے لیے مثال بن جائے۔ ایسے شخص کا اس کی قوم کی بھلائی پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ جس سے اس کے ملک کے لوگ محنت اور دل جمعی سے کام کرتے ہیں اور اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اگر انسان کا چال چلن اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ اچھا ہو تو اس کا اثر دوسرے لوگوں کی زندگیوں پر بھی پڑتا ہے۔ اگرچہ یہ اثر بظاہر نظر نہیں آتا لیکن خفیہ انداز میں لوگوں کی زندگیوں میں پھیل جاتا ہے۔ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے عظیم مثال بن جاتا ہے۔ وہ لوگ اس طریقۂ کار پر تحمل کر کے نہ صرف اپنی زندگیوں کو سنوارتے ہیں بلکہ اپنے ملک کو بھی ترقی دلوانے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

(ب) ''اسے اپنے ابا پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر وہ اس برائے نام روشنی پر قناعت کیوں کرتے ہیں؟ مٹی کا تیل اسے روزانہ کیوں نہیں ملتا؟ جب کہ گلی کے نکڑ والے خوبصورت دو منزلہ گھر میں تمام رات بڑی بڑی لالٹینوں کی روشنی ہوتی رہتی ہے۔۔۔۔ لیکن اس کا جھنجلایا ہوا دماغ یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اگر تیل لڑے بھڑے ملنے بھی لگے تو اس مد کے لیے دو پیسے روز کس کے گھر سے آئیں گے جب کہ اس کے باپ کو سخت محنت کی قیمت صرف اتنی ہی ملتی ہے کہ وہ جیے تو کیا ہاں جینے کی بھونڈی سی نقل اُتار رہا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے سیاہ طاق میں رکھا ہوا چراغ۔۔۔۔''

جواب: حوالہ متن:

سبق کا عنوان: چراغ کی لو   مصنف کا نام: ہاجرہ مسرور

سیاق و سباق:

اچھن کی ماں کو مرے ہوئے دو سال ہونے کو تھے۔ اچھن بھی روز بروز کمزور ہو رہی تھی؛ وہی

ماں کی طرح مسلسل کھانسی اور ہر وقت ہلکا ہلکا بخار۔ اس کا باپ دس روپے ماہوار پر ایک دکان پر ملازم تھا۔ بیوی کے مرنے پر کفن کا انتظام بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اب اچھن کے علاج کے لیے دوا کا بندوبست کیسے کرتا۔ باپ کی غیر موجودگی میں اچھن کو تنہائی اور گھر کا اندھیرا کھانے کو دوڑتا۔ باپ کے کہنے پر گھر کے چراغ کی لو ہمیشہ بہت ہی مدھم رکھی جاتی، کیونکہ تیل پر کنٹرول تھا اور ایک ہفتے بعد صرف دو پیسے کا تیل ملتا تھا۔ ایک روز اچھن نے چراغ کی لو بڑھانے کے لیے باپ سے کہا تو اس نے سختی سے روک دیا۔ اچھن کو سمجھ نہ آسکی کہ اس کے ابا اس برائے نام روشنی پر قناعت کیوں کیے بیٹھے ہیں۔ اور گلی کے نکڑ والے دو منزلہ گھر میں تمام رات لالٹینوں کی روشنی کیوں ہوتی رہتی ہے۔

تشریح:

باپ کی آواز سن کر اچھن نا امید ہوگئی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی دالان سے نکل آئی اور اپنی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر مایوسی کی حالت میں بیٹھ گئی۔ اسے اپنے باپ کی اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ وہ اس معمولی تیل پر صبر کیوں کر رہا ہے، جس سے گھر میں اچھی طرح روشنی بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس بات پر بھی حیران و پریشان تھی کہ انھیں ہر روز مٹی کا تیل کیوں نہیں ملتا، جس سے وہ گھر میں ضرورت کے مطابق روشنی کر سکیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ گلی کے کونے والے خوبصورت دو منزلہ مکان میں ساری ساری رات بڑی بڑی لالٹینوں کی روشنی ہوتی رہتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ان میں اور اس کے گھر والوں میں آخر کس بات کا فرق ہے؟ اس کا گھبرایا ہوا دماغ یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اگر تھوڑی بہت کوشش کر کے مٹی کا تیل ملنے بھی لگے تو اس کو حاصل کرنے کے لیے دو پیسے روز کس کے گھر سے آئیں گے۔ اس کے باپ کی آمدنی اتنی ہے ہی نہیں جس سے روز تیل کا حاصل کرنا ممکن ہو۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے باپ کو اپنے کام میں سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور اس محنت کی اُجرت اسے صرف اتنی ملتی ہے جس سے وہ جی نہیں سکتا، بلکہ جینے کی بھونڈی سی نقل ہی اتار سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے طاق میں رکھا ہوا چراغ، جس کی روشنی اتنی مدہم ہے کہ کمرے میں کھل کر روشنی بھی نہیں ہوتی اور اندھیرا بھی کم کم لگتا ہے۔ وہ دوسروں کے گھر میں جلتے ہوئے چراغ دیکھ کر اپنی محرومی پر کڑھ رہی تھی۔

سوال 4: کسی ایک نصابی سبق کا خلاصہ لکھیے اور مصنف کا نام بھی لکھیے: (9,1)

(الف) ادیب کی عزت (ب) اور آنا گھر میں مرغیوں کا

جواب:

(الف) ادیب کی عزت

مصنف کا نام: پریم چند

خلاصہ:

قمر صاحب کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ چینی اور دُودھ کے بغیر پتی کے ساتھ اُبلا ہوا پانی بیس دفعہ پی چکے تھے۔ چینی اور دُودھ کی طلب تھی بھی تو دل کو یوں سمجھا کر کہ بیوی کی نیند خراب نہیں کرنی چاہیے' پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اِس مفلسی کا سبب قمر صاحب کا اُدب سے تعلق تھا' جسے وہ جوانی سے نبھا رہے تھے۔ اُن میں ادیبوں کی شانِ بے نیازی موجود تھی اس لیے اُنھوں نے روزی کمانے کے کسی اور ذریعے کو نہ اپنایا تھا۔ دن رات بھوکے پیاسے رہنے سے اُن کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی اور وہ چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے کو چھونے لگے تھے۔ خوش قسمتی سے گھر والی ''سکینہ'' اُن کی ہم خیال تھی اور مال و دولت سے کوئی رغبت نہ رکھتی تھی۔ سکینہ کبھی خفا ہوتی تھی تو اُس بات پر کہ جب دن رات سر کھپانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو قمر صاحب کو اپنی صحت کے پیشِ نظر محنت میں کمی کر دینی چاہیے۔ تاہم قمر صاحب لکھنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اِس لیے اپنے مقصد سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔

قمر صاحب کو ایک دن کوئی دعوت نامہ موصول ہوا جس میں شہر کے کسی رئیس نے اُنھیں ایک تقریب میں مدعو کیا تھا۔ اِس پر اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سکینہ بھی خوش تھی لیکن اس کے خیال میں قمر صاحب کی پھٹے پرانے لباس کے ساتھ امیروں کی تقریب میں شمولیت اچھی نہ تھی۔ تاہم قمر صاحب رئیس کے دعوت نامے پر حد سے زیادہ خوش تھے اور تقریب میں ہر قیمت شامل ہونا چاہتے تھے۔ پس سکینہ کو بھی مجبوراً ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔

شام کے وقت قمر صاحب پھٹی پُرانی اَچکن' سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو اِنتہائی غیر مہذب دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے وہ کہیں جاتے تو دُکانداروں سے چھپ

چھپا کر نکلتے تھے، لیکن اِس دفعہ وہ بالکل خوفزدہ نہ تھے۔ اُنھوں نے پورے بازار کا چکر لگایا۔ گاہکوں کے رش کی وجہ سے دُکان داروں نے توجہ نہ کی تو اُنھیں چکر دُہرانا پڑا۔ اِس سے بھی کچھ نہ بنا تو وہ باری باری مختلف دُکانوں پر رُکے اور متعلقہ دُکان داروں، مثلاً حافظ صمد، بساطی اور کپڑے والے کو سلام کر کے اپنی موجودگی کا اِحساس دلایا۔ دونوں پہلے تو غصے ہوئے اور قرض کی فوری واپسی کا تقاضا کرنے لگے، لیکن یہ جان کر کہ قمر صاحب شہر کے راجا کی دعوت میں جا رہے ہیں، مرعوب ہو گئے اور اُلٹا اُنھیں کچھ اور سامان اُدھار لے جانے کی پیش کش کرنے لگے۔ حافظ صمد نے بڑے عجز سے ایک پان بنوا کر بھی پیش کیا۔

قمر صاحب، راجا صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو چراغ جل چکے تھے۔ اُمرا کی موٹریں کھڑی تھیں۔ باوردی دَربان موجود تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ قمر کو دیکھ کر وہ ٹھٹکے اور اُن سے دعوتی کارڈ طلب کیا۔ قمر صاحب کے پاس کارڈ تھا، مگر اُنھیں اِس مطالبے پر غصہ آ گیا کہ اُنھی سے کارڈ کیوں مانگا گیا! اِس پر استقبال کرنے والے تاڑ گئے اور معذرت خواہانہ اَنداز میں قمر صاحب کو محفل میں لے گئے۔ قمر اندر پہنچے تو راجا صاحب نے خیر مقدمی کلمات کہے۔ بیٹھے ہوئے مہمانوں سے تعارف کرایا اور اُن کی شاعری کی تعریف کی۔ ایک انگریزی سوٹ میں ملبوس شخص نے قمر صاحب کی ہیئت کذائی پر غور کرتے ہوئے اُن سے سوال کیا کہ کیا اُنھوں نے بائرن، شیلے اور ٹینی سن کا مطالعہ کیا ہوا ہے! قمر صاحب نے انگریزی شاعری سے معمولی واقفیت کا اِظہار کیا تو انگریزی پوش نے مشورہ دیا کہ وہ مذکورہ فنکاروں کی کتابوں میں سے کسی ایک کا ترجمہ کر کے اَدبی خدمت کر سکتے ہیں۔ قمر صاحب جو خود کو بائرن اور شیلے سے کسی لحاظ سے کم نہ سمجھتے تھے، برہم ہو گئے اور انگریزی پوش کو کھری کھری سنانے لگے کہ شاید اُنھوں نے ہندوستانی شعرا کا کلام نہیں پڑھا، جو بے تکی باتیں کر رہے ہیں!

محفل میں ایک اور شخص آئے جنھیں راجا صاحب نے ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ راجا صاحب نے قمر صاحب کو اُن سے بھی متعارف کرایا کہ: ''آپ حضرتِ قمر، شاعر ہیں۔'' ڈاکٹر

صاحب نے تعارف کو سرسری لیا اور ''اچھا آپ شاعر ہیں!'' کہ کر آگے بڑھ گئے۔ قمر صاحب کے ساتھ کئی مرتبہ ایسا ہوا اور ہر بار اُنھیں یہی داد ملی: ''اچھا! آپ شاعر ہیں!'' قمر صاحب اُمرا کے اَلفاظ کے طنزیہ مفہوم کو پہچان رہے۔ تھے کہ شاعر لوگ محض خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ ان مادیت کے اسیر اور روحانیت سے تہی لوگوں پر اُنھیں شدید غصہ آیا۔ وہ پچھتا رہے تھے کہ راجا کی دعوت میں کیوں شامل ہوئے! پس جب راجا نے محفل میں تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی تو اُنھوں نے صاف اِنکار کر دیا اور تقریب کے اختتام کا اِنتظار کیے بغیر گھر لوٹ آئے۔

(ب) اور آنا گھر میں مرغیوں کا

جواب کے لیے دیکھیے پرچہ 2015ء (دوسرا گروپ) سوال نمبر 4 (ب)۔

سوال :5- نظیر اکبر آبادی کی نظم ''تسلیم و رضا'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔ **(5)**

جواب : ''تسلیم و رضا''

خلاصہ:

''تسلیم و رضا'' میں نظیر اکبر آبادی نے درویشوں کے بارے میں بتایا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ یہ لوگ تسلیم و رضا کے حقیقی پیکر ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں دولتِ دنیا اور دنیاوی نعمتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ سادگی اور تسلیم و رضا کے پیکر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس حالت میں رکھے اس میں خوش رہتے ہیں۔ انھیں گھر بار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تنگدستی اور خوش نصیبی انھیں ان کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔ یہ لوگ خدا جانے فرشتے ہیں یا انسان ہیں کہ کسی حال میں بھی شکوہ نہیں کرتے، بلکہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

سوال :6- دو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے درمیان مہنگائی اور بے روزگاری کے موضوع پر مکالمہ تحریر کیجیے۔ **(10)**

جواب : (کالج کے دو دوست بازار میں خرید و فروخت کرتے ہوئے ملے اور یہ مکالمہ ہوا)

عمر: اسلام علیکم! حمزہ بھائی کیا حال ہے؟

حمزہ: وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں بھائی۔ اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں بھی رکھے۔ آپ کا کیا حال ہے؟

عمر: میں بھی ٹھیک ہوں۔ کیا بات ہے بھائی کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔

حمزہ: کیا بتاؤں دوست۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ آمدنی کے ذرائع کم ہیں اور اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ اُوپر سے عام رعایا پر حکومت کی عدم توجہ نے مہنگائی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

عمر: بالکل ٹھیک کہا۔ مہنگائی نے متوسط طبقے کی کمر توڑ دی ہے۔ اور اُوپر سے بے روزگاری کا مسئلہ۔ آخر غریب آدمی جائے تو کہاں جائے۔

حمزہ: اس افراطِ زر کے عذاب نے غریب سے دال روٹی بھی چھین لی ہے۔ ہر چیز کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اب تو عید پر بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو بھی پورا کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

عمر: جی بھائی کپڑے اور جوتے بہت مہنگے ہو گئے ہیں، اگر سارے افرادِ خانہ ایک ایک سوٹ اور جوتوں کا ایک ایک جوڑا بھی خرید لیں تو گھر کا سارا بجٹ اُدھر ہی جاتا رہے گا۔

حمزہ: دنیا جدید ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے ملک میں لازمی ضروریات کا حصول بھی ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

عمر: حمزہ بھائی میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ اصل میں ہمارے ملک میں قائداعظمؒ کے بعد کوئی حقیقی لیڈر آیا ہی نہیں ہے۔ ہمیں ایسے مخلص لیڈروں کی ضرورت ہے جو عیش و عشرت کی بجائے قربانی کے جذبے سے سرشار ہوں، تبھی ہمارے ملک سے مہنگائی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا خاتمہ ہو سکے گا۔

حمزہ: بھائی آخر ہمیں ہی مہنگائی اور بے روزگاری کی مار کیوں پڑ رہی ہے؟

عمر: اصل میں ہمارے نااہل حکمرانوں کی حکومتی پالیسیاں ہی ایسی ہیں کہ غریب رعایا براہِ راست اس سے متاثر ہو رہی ہے۔

حمزہ: اوپر سے ہر بجٹ میں ایسے نئے محصولات لگا دیے جاتے ہیں جو صرف عام عوام کو متاثر کرتے ہیں۔ اور روزگار کی فراہمی کے لیے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے جاتے۔ جس کی وجہ سے غریب

آدمی غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

عمر: بھائی، اس مہنگائی نے نہ صرف کھانے پینے کی اشیا کو متاثر کیا ہے، بلکہ صحت، تعلیم اور ذرائع آمد و رفت کی سہولیات بھی متوسط طبقے کی پہنچ سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔

حمزہ: صحیح کہہ رہے ہو یار۔ اس ملک کا اللہ ہی مالک ہے۔ حکومتِ وقت کو مخلص بنیادوں پر ایسے اقدامات کرنے چاہییں جن سے مہنگائی اور بے روزگاری کے طوفان میں کمی واقع ہو اور عام آدمی کو نفع ہو سکے۔

عمر: جی بھائی۔ میری بھی یہی دُعا ہے۔ آیئے، گھر کی طرف چلتے ہیں۔

(دونوں دوست اپنے اپنے راستوں کی طرف چل دیے۔)

(یا)

ایک کرکٹ میچ کی رُوداد تحریر کیجیے۔

"کرکٹ میچ کی رُوداد"

جواب:

کرکٹ کا کھیل تقریباً پوری دنیا میں نہ صرف کھیلا جاتا ہے، بلکہ بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی کرکٹ کے کھیل کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ نہ صرف ہر کالج اور سکول میں کرکٹ کی ٹیمیں موجود ہیں، بلکہ ہر چھوٹے بڑے شہر اور محلوں میں بھی ایسی ٹیمیں موجود ہیں، جو بڑے شوق سے اس کھیل کو کھیلتی ہیں۔

جس میچ کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا جا رہا ہے، یہ میچ ہمارے شہر کی ایک مشہور کلب کو ہسار کلب اور ہمارے کالج کی ٹیم کے مابین کھیلا گیا۔ میچ کے لیے 23 مارچ کا قومی دن منتخب کیا گیا تھا۔ چونکہ اس روز ملک بھر میں عام تعطیل تھی، اس لیے کرکٹ کے کھیل سے دلچسپی رکھنے والے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق لوگ میچ دیکھنے کے لیے ہمارے کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ میں وقتِ مقررہ سے پہلے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے بھی اپنے چند دوستوں کو اپنے ساتھ لیا اور کالج کے گراؤنڈ میں پہنچ گیا۔

دونوں ٹیمیں کالج گراؤنڈ میں پہنچ چکی تھیں۔ وہ اپنی اپنی مخصوص وردیوں میں ملبوس تھیں۔

ٹھیک نو بجے امپائر گراؤنڈ میں نکلے۔ کوہسار کلب اور ہمارے کالج کی ٹیم کے کپتان بھی گراؤنڈ میں آ گئے۔ ٹاس کیا گیا جو کوہسار کلب نے جیت لیا۔ چنانچہ کوہسار کلب کے کپتان نے اپنے دو اوپننگ بیٹسمین کھیل کے لیے میدان میں بھیج دیے۔ گراؤنڈ میں کھلاڑیوں کی آمد پر تمام تماشائیوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کھیل شروع ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ کوہسار کلب کا ایک کھلاڑی کلین بولڈ ہو گیا۔ ہمارے کالج کے لڑکوں نے اس پر خوب تالیاں بجائیں اور شور و غل کیا۔ کوہسار کلب کی پہلی وکٹ بیس رنز پر گری تھی۔ ان کا سکور صرف تیس رنز تھا کہ امپائر نے ان کے ایک کھلاڑی کو ایل بی ڈبلیو قرار دے دیا۔ اب تو ہمارے کالج کے لڑکوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انھوں نے سیٹیاں بجا بجا اور نعرے لگا لگا کر اپنے کھلاڑیوں کو خوب داد دی۔ کوہسار کلب کے کھلاڑیوں پر مایوسی سی طاری ہو گئی۔ ہمارے کالج کے باؤلر بڑی مستعدی سے باؤلنگ کر رہے تھے۔ ان کے حوصلے بھی بلند معلوم ہو رہے تھے۔ کوہسار کلب کے سو رنز مکمل ہونے پر تماشائیوں نے شور و غل مچا کر اور تالیاں بجا کر کھلاڑیوں کو بھرپور داد دی۔ ہمارے کالج کی ٹیم کے کپتان نے اب خود باؤلنگ کا فیصلہ کیا۔ تھوڑا ہی وقت گزرنے کے بعد کوہسار کلب کا کوئی کھلاڑی جم کر نہ کھیل سکا۔ چنانچہ ان کا ہر کھلاڑی تھوڑے تھوڑے رنز بنا کر آؤٹ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کے تمام کھلاڑی 175 رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔

دوپہر کے کھانے کے وقفے کے بعد ہمارے کالج کی ٹیم نے کھیلنا شروع کیا۔ میدان میں تماشائیوں کی زیادہ تعداد ہمارے کالج کے طلبا پر مشتمل تھی۔ اس لیے ہر ایک رن پر ہمارے پہلے دونوں کھلاڑی قدرے احتیاط سے کھیلے' لیکن پانچویں اوور کے بعد انھوں نے زوردار سٹروک لگانے شروع کر دیے اور دسویں اوور کے آغاز سے قبل ہی سو رنز بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ میدان میں موجود طالب علموں نے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ ہمارے دونوں بیٹسمین ضرورت سے زیادہ پُراعتماد ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بعض خطرناک گیندوں پر اس طرح سٹروک لگائے کہ بارھویں اوور تک پہنچتے پہنچتے دونوں کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہو گئے۔ مخالف ٹیم کے تماشائیوں نے اس پر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور اپنے کھلاڑیوں کو بھرپور داد سے نوازا۔ ہماری ٹیم کے کھلاڑیوں کی دوسری جوڑی نے قدرے احتیاط سے کھیلتے ہوئے آہستہ آہستہ رنز میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اس

حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہ دونوں کھلاڑی بڑے اعتماد کے ساتھ جم کر کھیلتے رہے۔ میچ میں اگرچہ ہماری فتح یقینی ہو چکی تھی۔ ہر چوکے اور چھکے پر طالب علموں کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ اب چھے رنز بقایا تھے اور لڑکوں کی خواہش تھیں کہ چھکا ہی لگنا چاہیے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ہمارے کھلاڑی نے اس زوردار طریقے سے گیند کھیلا کہ چھے رنز ہو گئے۔ خوشی سے تمام لڑکوں نے کھیل کے میدان میں بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ دیر تک طالب علم نہایت خوشی و مسرت سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔

سوال :7- ڈسپنسری کے اجراء کے لیے ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کے نام درخواست تحریر کیجیے۔ **(10)**

جواب : جواب کے لیے دیکھیے پرچہ 2015ء (دوسرا گروپ) سوال نمبر 7۔

سوال :8- درج ذیل عبارت کی تلخیص کیجیے اور مناسب عنوان بھی تحریر کیجیے: **(8,2)**

فطری طور پر انسان ایسا واقع ہوا ہے کہ دوسروں کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے ندامت محسوس کرتا ہے اور دوسروں کے سامنے اپنے گناہ چھپاتا ہے، لیکن جب انسان اللہ کی بارگاہ میں ہم کلام ہو تو وہ حقیقت سے کام لیتے ہوئے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔ گناہ کرنا اس کی سرشت میں داخل ہوتا ہے لیکن وہ اس کی رحمت سے ہرگز بھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تو ستر ماؤں سے بڑھ کر زیادہ مشفق ہے وہ اس کی توبہ لازمی قبول کرے گا۔ اس لیے جب انسان سچے دل سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور توبہ کرے تو اللہ اسے معاف کر دیتا ہے۔

جواب : عنوان: "فطرتِ انسانی"

تلخیص:

فطری طور پر انسان لوگوں سے تو اپنے گناہوں کو چھپا سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے گناہوں اور غلطیوں کو چھپانے سے قاصر ہے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور اس کی توبہ قبول کریں گے اور اسے معاف کر دیں گے۔